بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلہ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ و تمدن (۴)

واذا تلیت علیہم آیاتہ زادتہم ایمانا

ایمان

یعنی

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مدظلہ العالی

کی وہ جامع تقریر جو انھوں نے

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے زیر اہتمام اسلامی ہفتہ کے عظیم الشان اجتماع میں بتاریخ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء زیر صدارت

عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر الحاج مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی بالقابہ کی

اور حسب ایماء

جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی نائب صدر انجمن مذکور

CHECKED
Date..........

محامد اللہ انصاری معتمد نشر و اشاعت

نے

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع کرا کر شائع کی

بار اول

جلد ایک ہزار

۱۲۹۶ ۱۳۹۵ ۱۰۹۱۰

۷۸۶

عرض ناشر

خدائے عزوجل کے فضل وکرم سے آج ہم اپنے مطبوعات کے سلسلے کی چوتھی کڑی اپنے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں جو اپنے عنوان اور موضوع کے اعتبار سے ہمارے گذشتہ نمبروں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس نمبر کے اوراق اس بلند پایہ، جامع، پُرمغز، دلپذیر اور دلنشین تقریر کے حامل ہیں جو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مدظلہٗ العالی نے گذشتہ اسلامی ہفتہ کے موقعہ پر "ایمان" کے اہم موضوع پر فرمائی تھی اور بعدہٗ محترم ومعظم جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کی فرمائش پر علامہ موصوف سے منضبط کرا کر شائع کی جا رہی ہے۔

علامہ سلیمان ندوی صاحب اس دور کے ایک بلند پایہ ادیب، وسیع النظر ومتبحر عالم، دقیق النظر وحقیقت شناس فاضل، مقتدر مورخ اور مایہ ناز مقالہ نگار ہیں جن کی علمی پوزیشن (مولانا طیب صاحب کی تحریر کے بموجب) توصیف وتعارف سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔

پیش نظر مقالہ "ایمان" کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ وہ آپ کا ایک بلند پایہ علمی شاہکار اور گراں قدر قلمی کارنامہ ہے جسے آپ نے بیش بہا معلومات، ایمان کی چاشنی، زبان کی لطافت، اور پیرایہ بیان کی دلآویزی سے مالا مال کر کے ذٰلک صریح الایمان کا مصداق بنا دیا ہے اور بات ایمان کی یہ ہے کہ یہ حضرت مولانا ہی کا حصہ ہے۔ حضرت ممدوح نے اس معرکۃ الآرا مضمون میں اجتماعی تنظیم، فلسفۂ ایمان، اساس ملت، خصوصیات ایمانی، ایمان و عمل کا تلازم، مومن و کافر کا فرق، نظام اسلام اور توحید کی حقانیت پر ایسے دلنشین اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ جس طرح بوقت تقریر سامعین کے قلوب نقشِ ایمانی

سے مخمور ہوگئے تھے اسی طرح ہمیں امید ہے کہ ناظرین کرام کے دماغ اس کوزۂ ایمانی کے مطالعہ سے قند مکرر کے لطف کے ساتھ ساتھ حقائق ایمانی سے بھی معمور ہوجائیں گے اور اس سے جو بہتر دینی نتائج پیدا ہوں گے اس کے ثواب کے مستحق ہمارے مخلص اور سرگرم سرپرست جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی اور پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب ہوں گے جنکی مساعی جمیلہ سے اس مفید اور کارآمد سلسلے کا آغاز ہوا اور ان حضرات سے زیادہ لائق ستائش ہمارے سرگرم وائس چانسلر آنریبل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ کی رہنمائی، سرپرستی وہمت افزائی ہے جو حضرت موصوف نے اپنے گذشتہ دور وائس چانسلری میں اس انجمن کی بنیاد وقیام میں کی اور اب اپنے اس نئے مبارک دور میں فرمارہے ہیں۔ قارئین کرام کو بخوبی یاد ہوگا کہ آج سے پانچ چھ سال قبل وائس چانسلر صاحب موصوف ہی نے اس انجمن کی بنا ڈالی تھی۔ اس عرصے میں انجمن نے جو مفید خدمات انجام دیں وہ حضرت ممدوح ہی کی رہنمائی وسرپرستی کا نتیجہ ہیں اور اب انجمن نے ایک وسیع پیمانہ پر جو سلسلہ مطبوعات کا بیڑہ اٹھایا ہے وہ آپ ہی کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ اگر حق تعالے جل شانہ کا فضل وکرم اور قبلہ موصوف کی ہمت افزائی وسرپرستی شامل حال نہوتی تو ہم اس قدر جلد اپنے پانچ مفید نمبر شائع نہ کرپاتے...... ہم رب العزت جل مجدہ کی بارگاہ میں بصد ادب واحترام دست بدعا ہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ان کی بیش بہا خدمات کا اجر عظیم عطا فرمائے اور ملک و ملت خصوصاً مادر درسگاہ کی فلاح وبہبود کی عظیم الشان خدمات ان سے لے آمین ثم آمین۔

پیش نظر رسالہ کا اجمالی تعارف سطور بالا میں کیا جاچکا ہے ہماری درخواست پر حضرت مولانا طیب صاحب نے اس مقالہ پر اپنی فاضلانہ تقریظ لکھ کر ارسال فرمائی ہے جو ہم دلی شکریہ کے ساتھ شائع کررہے ہیں حضرت مولانا کی تقریظ سے قارئین کرام پر اس مضمون کی مستقل فضیلت واضح ہوجائے گی۔

قبلہ سید صاحب کے اس جامع مضمون کو ہم بنیادی للایمان تصور کرتے ہیں۔ اور

بارگاہ رب العزت میں بصد ادب و احترام رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْاِيْمَانِ ۔
کا ورد کرتے ہیں خدا کرے ہمارا یہ ورد بارگاہ رحمٰن و الرحیم میں مقبول ہوجائے اور مولانا ندوی کا
یہ مقالہ واقعی ہم طالبان علم و عمل کے لئے ینادی للایمان ثابت ہو جس کے تحت ہم اپنے اندر صحیح
دینی صلاحتیں یتفکر فی الدین، عرفان ذات باری تعالےٰ فہم قرآن اور استحقاق نیابت الٰہی
پیدا کرسکیں۔ آمین یا رب العٰلمین ۔

جیسا کہ ہم اوپر کی سطور میں ظاہر کرچکے ہیں اس رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ
ہمارے سلسلۂ مطبوعات کا پانچواں نمبر" تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے
نام" بھی شائع ہوگیا ہے۔ اس کی تفصیل سرورق کی پشت پر ملاحظہ فرمائیے ۔

اس مقالے کی اشاعت کے بعد سال رواں میں ہم حسب ذیل نمبر اور شائع کرنے ہیں۔
(۶) اسلامی تہذیب و تمدن ۔ از حضرت مولانا محمد طیب صاحب۔ (۷) ضرورت ہادی و ختم نبوت۔ از حافظ
کفایت حسین صاحب (۸) سیاست محمدی (مضمون انعامی مقابلہ)۔

اوّل الذکر دو نمبروں کے مسودے مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود ہنوز موصول
نہیں ہوئے اس لئے ہم اپنے ہر دو اکابرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد رسائل مذکور
کے مسودے مرتب فرما کر ارسال فرما دیں تاکہ ان کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔

یہ میرا خوشگوار فرض ہو کہ ان تمام اساتذۂ کرام، اقامت خانوں کے نگراں صاحبان اور فرزندان
مادر درسگاہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کروں جنہوں نے انجمن کی ماقبل مطبوعات کی توسیع اشاعت
میں غیر معمولی تعاون فرما کر ہماری ہمت افزائی کی اور مذہبی لٹریچر سے اپنے دلی شغف کا ثبوت دیا۔
وہ مقتدر علماء و فضلاء ملت اور ملک کے مشہور جرائد و رسائل کے مدیر صاحبان
بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے ہماری گذشتہ مطبوعات پر اپنی عالمانہ تقاریظ اور
فاضلانہ تبصروں میں ہماری قدر افزائی کی ۔

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

حامد اللہ انصاری عفی عنہ
معتمد نشر و اشاعت

تقریظ

از فخرالاماثل حضرت الحاج مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی

(ناظم جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند)

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔

اس عالم کون و فساد میں چونکہ انسان کے جسم و روح پر فسادات و آفات اور سلبی تغیرات کا پیاپے ورود ناگزیر تھا اس لئے خدا کی فیاض قدرت نے ان دونوں جوہروں کی تہذیب و شائستگی کے لئے دو ہی بدرقے تجویز فرمائے روح کے تصفیہ کے لئے حقائی افکار و عقائد جن کے مجموعہ کا نام شرائع کی زبان میں ایمان ہے اور جسم کے تزکیہ کے لئے پاکیزہ اعمال جن کے مجموعہ کا نام اسلام جسے عمل صالح بھی کہتے ہیں ۔

ایمان و اسلام میں وہی نسبت ہے جو روح و جسم میں ہے ۔ یعنی ایمان روح کی طرح ایک مخفی اور باطنی حقیقت ہے جس کا ادراک دیدۂ بصیرت سے ہوتا ہے اور اسلام جسم کی طرح ایک کھلا ہوا ظاہری پیکر ہے جس کا احساس چشم بصارت کرتی ہے ارشاد نبوی ہے ۔

الایمان سرٌّ والاسلام علانیة

ایمان ایک مخفی چیز ہے اور اسلام علانیہ ہے ۔

گویا ایمان ایک تخم سعادت ہے جو دلوں کی زمین میں بکھیر دیا جاتا ہے اور اسلام اس کا شجرۂ طیبہ ہے جو اس تخم کی بالیدگیوں سے سر نکالتا اور اپنی طبیعی تربیتوں کے ماتحت ایک تناور درخت بنجاتا ہے جس کے سایہ تلے اس کی آبیاری کرنے والا دنیا و آخرت کی ہر ساعت میں فلاح و بہبود کی دائمی زندگی گذارتے ہوئے راحت و مسرت کے شیریں پھلوں سے منتفع ہوتا رہتا ہے ۔

مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا

کلمۂ طیبہ کی مثال اس پاک درخت کی سی ہے جس کی جڑیں تو زمین میں گڑی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ جو اپنا پھل (بارہ مہینے) ہر ہر ساعت دیتا رہتا ہو۔

ایمان و اسلام کی اس نسبت کے ماتحت اگر ایمان کا تخم ہی دلوں کی زمین میں نہ ہو تو اسلام کا شجر ہی نہیں اُگ سکتا اور اگر اسلام کا شجر یا اس کی شاخیں قطعے و برید ہوتی رہیں تو ایمان کا تخم سوخت ہو جائے جس سے واضح ہے کہ ایمان و اسلام یا عقیدۂ و عمل ایک دوسرے سے کسی وقت بھی بے تعلق نہیں رہ سکتے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے جن کی علمی پوزیشن توصیف و تعارف سے بے نیاز اور بالاتر ہے زیر نظر مضمون " ایمان" میں اسلام و ایمان کے اسی درمیانی رابطہ کو اپنے خاص انداز میں درشنگاف فرمایا ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ خوب ہی درشنگاف فرمایا۔

آپ نے اصولاً یہ دکھلا کر کہ مسلمانوں ہی کی نہیں دنیا کی ہر قوم کی عملی زندگی اس کی فکری اور اعتقادی زندگی سے وابستہ ہے اور وہی فکر و اعتقاد اس کا ایمان ہے۔ تاریخی حقایق کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ جن اقوام کا ایمان وطنیت۔ قومیت۔ نسلیت رنگ دلون اور دولت وغیرہ جیسے تنگ محدود و تغیر پذیر متزلزل اور فانی رشتوں سے وابستہ ہے ان کی عملی زندگی حقیقت و بقاء سے دور تفرق و تحزب سے لبریز حسن اخلاق اور خوبی کردار سے بے تعلق اور اتفاقات باہمی سے بیگانہ ہے۔ جس کی صورت ایک سراب کی سی ہے کہ اس کی سطحی چمک ممکن ہے کہ دور سے نگاہوں کو دھوکہ میں ڈال سکے لیکن بلحاظ حقیقت اُس میں اصلیت و واقعیت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس لئے وطنیت و قومیت کے عقیدے عمل اور حسن نتائج کے میدان میں ناکام رہے جن کی نامرادی تاریخی حیثیت سے بھی دنیا پہ ثابت ہوتی آئی ہے۔ اور آج مشاہدہ محسوسات کی دنیا میں بھی سامنے آگئی ہے۔

ہاں وہ عقیدہ جو اپنے واقعاتی استحکام، اخلاقی کمک اور کلیت و جامعیت کے لحاظ سے دنیا کی منتشر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لا سکتا ہے جو ایشیا و یورپ اور ان کی اندرونی تقسیموں کی خلیجیں پاٹ کر دنیا کی بکھری ہوئی قومیتوں کے لئے ایک مستحکم بندھن کا کام دے سکتا ہے وہ صرف اسلامی توحید اور اس سے پیدا شدہ اصول کا عقیدہ ہے۔ کیونکہ یہ لطیف تر مگر قوی تر رشتہ ان تنگ میدان معیاروں کے بجائے اس لامحدود ذات اور اس کے لامتناہی کمالات سے وابستہ ہے جس کی ذات و صفات تک کسی ادنیٰ حد بندی کسی ادنیٰ تغیر و انقلاب اور کسی معمولی سے معمولی تفرق کے واہمہ کی بھی رسائی نہیں ہے اس لئے ہمہ گیری اور دوام و استحکام اسی عقیدہ کا امتیاز اور اجتماعیت و جامعیت اسی کی معتقد اقوام کا شعار ہو سکتا ہے۔

علامۂ ممدوح کا یہ بلند پایہ مقالہ جس طرح ایمان و اسلام کی حقیقت اور باہمی نسبت کے لئے ایک بصیرت افروز بیان ہے اس سے کہیں زیادہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ایک نہایت ہی موثر تبلیغی اقدام بھی ہے جس کے ذریعہ اسلام کا ایک اساسی پیغام پہونچایا گیا ہے اس لئے ہر انسان کو، ہر مسلمان کو اور خصوصاً اس مقالہ کے اولین مخاطبوں (طلبار و اساتذۂ مسلم یونیورسٹی) کو اس پیغام کے ماتحت اپنی اپنی عملی زندگی کا جائزہ لینا چاہیئے تعلیمی اداروں کی عملی زندگی تعلیم و تربیت ہے اس لئے ہماری مسلم یونیورسٹی کے اس اساسی عمل (تعلیم و تربیت) کا بھی کوئی نصب العین کوئی اندرونی عقیدہ اور کوئی کریڈ ہونا چاہیئے جو اس عمل میں بنیادی حقیقت قومی جامعیت۔ اخلاقی ہمہ گیری۔ اور باطنی للّٰہیت پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ مولانا کے اس پیام کی رو سے وہ نصب العین نہ روٹی ہو سکتا ہے نہ ملازمت۔ نہ قومیت بن سکتا ہے نہ افزائش دولت۔ نہ معاشی تکلفات ہو سکتے ہیں نہ معاشرتی تصنّعات۔ کہ ان عقیدوں کی ناکامی اور نامرادی آج ہر نہج سے کھلکر سامنے آچکی ہے۔ ہاں پھر اس تعلیم کا وہ بامعنی کریڈ اور پُر حقیقت نصب العین جو اسے ایک اسلامی شعار کی حیثیت میں پیش کر سکتا ہے وہی مولانا کے مقالہ کا ثابت کردہ موضوع توحید ہو سکتی ہے جس کے معنی یک رُخی، یک رُوئی اور یکسوئی کے ہیں۔

یعنی ہماری یہ تعلیم محض ایک خدا کے لئے ہو۔ اسی سے ہمیں اس معاملہ میں طمع ہو اور اسی سے خوف۔ اسی سے اُمید ہو اور اسی سے بیم۔ ہم ہر نتیجہ کو اسی کے نام پہ چاہیں اور اسی کے لئے قبول کریں۔ اسی سے حسن آغاز کریں اور اسی سے حسن انجام کے متوقع رہیں۔ ہم متفرق کمزور معبودوں، قوم۔ وطن۔ دولت۔ ثروت۔ جاہ۔ باہ۔ نفس اور ہوٰی سے بہتر ایک ہی طاقتور معبود واحد قہار کو اپنی ہر نقل و حرکت کا سہارا، ہر قول و عمل کے سیپارہ کا شیرازہ کہیں اور اسی کا رشتہ تصور ہماری ہر تصدیق کی جان ہو۔ ہمارے تعلیمی اصول، اصول کے تحت میں طریق عمل اور میدان عمل میں حرکت و سکون حتیٰ کہ طبعی تقاضوں کے طرز رہائش و آسائش اور آرائش و زیبائش سب ہی کچھ ایک پیکر ہو جس کی رُوح بھی توحید ہو۔ ہم اپنے پڑھنے لکھنے رہنے سہنے عبادت و عادت، خلوت و جلوت، انفراد و اجتماع، مذاکرہ و مکالمہ اور ذکر و مراقبہ وغیرہ میں ہر وقت ایک کی دُھن ایک کا دھیان اور ایک کا گیان رکھیں۔

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس　　ہمیں است بنیاد توحید و بس

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری پوری زندگی کا واحد معیار لا آلہ الا اللہ ہو مگر وہ لا آلہ الا اللہ جو محمد رسول اللہ کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔ تاکہ ہم توحید کے اصول کے ماتحت جہاں اشتراک کی آلودگی سے بچیں وہیں سُنن رسالت کے ماتحت ابتداع و اختراع کی ناپاکیوں سے بھی آلودہ نہونے پائیں۔ موحد بھی ہوں اور متبع بھی یعنی مشرک بھی نہوں اور مخترع بھی نہ بنیں۔

اگر سچ مچ ہمیں یہ توحید نصیب ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ جہاں مولانا کو مقالہ نگاری کی محنت وصول ہو جائے گی وہیں ایک مرکزی فکری اور عملی زندگی بھی نمونہ بن کر ملک کے ایک بڑے طبقہ کے لئے عقیدہ و عمل کا دروازہ کھولیگی اور بے شمار افراد کا ایک عظیم گروہ ایمان و اسلام کی حقیقی دولت سے مالا مال ہو سکے گا۔

خدائے برتر و توانا پر یہ کیا بھاری ہے کہ وہ ہماری مسلم یونیورسٹی کے کار آمد افراد

کارکن اجزاء و اعضاء کو اس مقدس پیغام کا علماً حامل۔ عملاً قابل اور قولاً سچا داعی بنا دے اور اس طرح اس جامعہ کے وسیع اثرات کے ماتحت اسلام کا یہ اساسی پیغام ساری دنیا کے کانوں تک پہونچ جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز و باللہ التوفیق

دارالعلوم دیوبند
۳ جمادی الاول ۱۳۶۰ھ

احقر
محمد طیب غفرلہ

۲۹۷
۲۹۵
۹۲۸۱

۷۸۶

ایمان

جماعتوں کی تنظیم کسی ذہنی اساسِ ملت اور بنیادِ عمل سے ہوتی ہے

دنیا کی وہ تمام عظیم الشان قومیں جنھوں نے دنیا میں کوئی بڑا کام کیا ہے، یا جو دنیا میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے پورے نظام ہستی کو کسی ایک قانون پر مبنی کریں، اور اپنی تمام منتشر قوتوں کو کسی ایک اصول کے تحت مجتمع کریں، زندگی کے سینکڑوں شعبے اور بقائے ہستی اور ترقی کے ہزارہا شاخ در شاخ اعمال جو دیکھنے میں تمامتر منتشر، پراگندہ، متفرق، اور ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں، ان سب کے درمیان ایک واحد نظام، ایک متحدہ اصول، ایک مشترکہ جامعیت پیدا کریں، جس کا شیرازہ ان متفرق و پراگندہ اوراق کو ایک منظم کتاب بنا دے۔

دنیا جب سے بنی ہے، تب سے آج تک ہزارہا قومیں پیدا ہوئیں اور مری ہیں، لیکن کسی قوم نے اس وقت تک ترقی نہیں کی ہے جب تک اُس کے اندر اُسکی زندگی کا کوئی واحد نظام نہیں پیدا ہوا ہے، اور کسی واحد تخیلّ نے اُن کے اندر یہ اہمیت نہیں پیدا کرلی ہے، کہ وہ اس کے تمام افراد کی زندگی کی غرض و غایت، اور اُس کے تمام اعمال کا مرکز و مرجع، اور جہت و قبلہ نہ بن گیا ہو، وہی واحد تخیلّ بڑھکر واحد جماعت، اور اس سے بھی زیادہ پھیل کر ایک واحد ملت کی تخلیق و تکوین کرتا ہے۔

ہم اس کو ایک مثال میں سمجھانا چاہتے ہیں، روم کی سلطنت کا آغاز ایک گاؤں سے ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ نقطہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ صدیوں میں ایک عظیم الشان دائرہ بن گیا۔

اس دائرہ کا نقطۂ خیال مرکزِ اتحاد، جہتِ اشتراک، اساسِ جامعیت "رومیت" قرار پائی، جس نے رومیت کے اصول کو تسلیم کیا، اس کو شہر روم کے باشندوں کے حقوق عطا ہوئے، اور جس نے قبول نہ کیا، یا جس کو یہ شرف خود رومیوں نے عطا نہیں کیا، وہ ان حقوق سے محروم رہا، صدیوں تک یہ رومیت، رومی قوم کی زندگی کا شعلۂ حیات رہی، اور اسی کی روشنی سے پورا رومن امپائر اسپین سے لیکر شام تک جگمگاتا رہا۔ مگر جیسے جیسے یہ روشنی ماند پڑتی گئی، اندھیرا چھاتا گیا، اور جیسے جیسے رومی عمارت کی یہ مستحکم بنیاد کمزور پڑتی گئی، ڈھتی گئی، یہاں تک ایک دن یہ عمارت گر کر زمین کے برابر ہو گئی۔

الغرض قوموں کی موت و حیات کسی ایک "تخیّل" کی موت، و حیات پر موقوف ہے جس کی زندگی سے ان کی زندگی، اور جس کی موت سے ان کی موت ہے، گذشتہ جنگ میں اور اس جنگ میں بھی آپ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ انگریز جرمن، یا جرمن انگریز سے لڑ رہے ہیں، نہیں، انگریزیت جرمنیت سے یا جرمنیت انگریزیت سے لڑ رہی تھی، اور لڑ رہی ہے، قوم قوم سے نہیں لڑتی ہے، بلکہ ایک یقینی تخیّل، دوسرے یقینی تخیّل سے لڑتا ہے۔

قوم کی زندگی کا وہ یقینی تخیّل، اس کے تمام کاموں کی اساس و بنیاد بنجاتا ہے، پوری قوم اور قوم کے تمام افراد اُس ایک نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں، وہ نقطۂ ماسکہ اُنکی پوری زندگی کا محور بن جاتا ہے، اُسی ایک تخیّل کا رشتہ منتشر افراد کو بھائی بھائی بناکر ایک قوم کے مشترکہ افراد ترتیب دیتا ہے، اور ایک واحد، متحد، منظم اور قوی قوم بناکر کھڑا کر دیتا ہے۔

جب کبھی دو قوموں کا مقابلہ ہوگا، تو ہمیشہ اس کو فتح ہوگی، جس کا نقطۂ تخیّل زبردست ہوگا، اور جس کے افراد اس رشتۂ حیات میں سب سے زیادہ مستحکم بندھے ہوں گے، اور جو اپنے اس مشترک اساس و بنیاد پر سب سے زیادہ متفق و متحد ہونگے عربوں نے اسی قوت سے قیصر و کسریٰ کو شکست فاش دی، عربوں کے پاس ایرانیوں کے

خزانے اور نہ رومیوں کے اسلحے تھے، مگر اُن کے پاس وہ قوتِ ایمانی تھی جس سے ایرانی اور رومی محروم تھے۔

جب کوئی قوم تنزل پذیر ہوتی ہے، تو اُس کی وہی قوت ایمانی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کی وہی مشترک اساس و بنیاد منہدم ہونے لگتی ہے، اور قوم کی زندگی کا مقصد اس مشترکہ قومی غرض و غایت سے ہٹ کر اپنے اپنے نفس، اپنے اپنے خاندان، اپنی اپنی جماعت میں بٹ جاتا ہے، اس لئے اس میں قومی خائن پیدا ہوتے ہیں جن کے پیش نظر اس مشترکہ جامعیت کے فوائد و نقصانات کے بجائے خود اپنی ذات و خاندان کا فائدہ و نقصان ہوتا ہے۔

مٹھی بھر انگریزوں نے اسی ہندوستان کے روپئے سے، ہندوستان کے سپاہیوں سے، خود ہندوستان کو فتح کیا، حالانکہ اس وقت پورے ملک میں اودھ، روہیلکھنڈ، بنگال، مرہٹہ، میسور، حیدرآباد کی ایسی عظیم الشان طاقتیں تھیں، جن کے بس میں تھا کہ انگریزوں کو پوری طرح شکست دیدیں، مگر ایسا نہ ہوسکا، اس لئے کہ انگریزوں کے سامنے ایک متحدہ مشترکہ تخیل تھا، جس پر پوری قوم متفق تھی، جو انگریز جہاں بھی تھا، چاہے وہ سپاہی ہو، یا گودام کا کلرک ہو، یا سوداگر ہو، یا ڈاکٹر ہو، یا جنرل ہو، یا گورنر ہو، ہر ایک کے سامنے ایک ہی بلند مقصد تھا، اور وہ انگلستان کی سربلندی اور عظمت، لیکن ہندوستانیوں کے سامنے باوجود طاقت و قوت کے کوئی ایک متحدہ غرض، مشترکہ جامعیت، واحد اساسِ کار، اور متفقہ بنیادِ عمل نہ تھی، جس کا بچاؤ، جس کی حفاظت، اور جس کا اعلاء، پوری قوم کی غرض و غایت، اور بنیاد و اساس ہوتی، ہر نواب، ہر رئیس، ہر سپہ سالار، ہر سپاہی، اور ہر نوکر کا مقصد اپنی فکر اور اپنی ترقی تھی، اس حالت میں نتیجہ معلوم۔

اب ایک اور حیثیت سے نظر ڈالئے، دنیا کی ہر متمدن قوم کے پورے نظامِ زندگی کا ایک اصل الاصول ہوتا ہے، فرض کرو کہ آج روسی بالشوسٹ کے پورے نظام کا ایک

واحد نقطۂ خیال ہے، اور وہ سرمایہ داری کی مخالفت ہے، جو اس نظام کی اصل اساس ہے، اب جس قدر اس نظام کی شاخیں، شعبے، صیغے، اور کام ہیں، سب ایک اصل الاصول یعنی "سرمایہ داری کی مخالفت" پر مبنی ہیں، اسی طرح ہر ترقی یافتہ قوم کے تمدن اور نظام ہستی کا ایک اصولی نقطہ ہوتا ہے، جس کے تحت میں اس تمدن اور نظام ہستی کے تمام شعبے اور فروع ہوتے ہیں۔

اسی طرح آج انگریزی جد وجہد کی بنیاد، انگریزی سرمایہ داری، امریکن تمدن کی بنیاد، امریکن سرمایہ داری نازی تمدن کی بنیاد جرمن قوم کی سربلندی، اور فسٹ کی بنیاد پرانی رومی قیصریت کی دوبارہ تعمیر پر ہے، اگر کسی تمدن اور نظام کا یہ سرا نکال دیا جائے، تو اس تمدن کے تمام اجزار اور اس نظام کے پورے شعبے، بے معنی، بے سود، اور بے اساس ہوکر رہ جائیں، اور چند ہی روز میں وہ تمام سررشتے تار عنکبوت ہوکر نابود ہو جائیں، اسی لئے ہر قومی تمدن، اور نظام ملت کو سمجھنے کے لئے اس کے اس اساس کار، سررشتۂ خیال، اور اصل الاصول کو سمجھنا چاہئے، جب تک وہ سرا ہاتھ نہ آئیگا اس نظام ملت کا الجھاؤ سلجھ نہیں سکتا۔

ملتوں کا اختلاف متخیلہ کے اختلاف سے ہے

اس نکتہ کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں گو ہزاروں ملتیں اور قومیتیں ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ملت و قومیت کا اصل انفرادی تشخص، اور امتیازی وجود، اس کے گوشت، پوست، ہڈی اور رنگ و روغن سے نہیں یہ تو اوپری سطح اور ظاہری تسشر پر کے نشانات اور خطوط ہیں، ان کا اصل انفرادی اور مستقل تشخص اور امتیازی وجود ان ایمانیات اور یقینیات سے ہے، جو ہر ایک کے دل میں بسے، اور ہر ایک کے رگ و ریشہ میں رچے ہوئے ہیں۔

آج ہندوستان میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، جین، سکھ ہزاروں قومیں آباد ہیں، شکل وصورت اور رنگ وروپ کے لحاظ سے ان میں کوئی تفاوت نہیں، اگر ہے تو ہر ایک کے اس متخیّلہ میں ہے جس سے اُس کی ملت کی تعمیر ہوئی ہے، اس لئے کسی ملّت کے متخیّلہ کو بدل دینے کے معنی اُس ملّت کو مٹا دینے کے مرادف ہے دنیا میں جو کمزور قومیں فنا ہوئی ہیں ان کی صورت یہی ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنا متخیلہ ایمانی چھوڑ کر کسی دوسری طاقتور قوم کے متخیّلۂ ایمانی کو قبول کر لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم مٹ گئی اور دوسری قوم میں ضم ہو کر وہ خود فنا ہو گئی، ہندوستان کے یونانی سیتھین اور بودھ کیا ہوئے؟ ایرین ہندوؤں میں سما گئے، ایران کے مجوسی کدھر گئے، مسلمانوں میں مل گئے، مصر کے قبطی کہاں گئے، عربوں میں شامل ہو گئے، سسلی اور اسپین کے عرب کیا ہوئے۔ اٹلی اور اسپین والوں میں گھل گئے۔

تجدید کی سعی بھی اسی متخیّلہ کی مدد سے ممکن ہے

کسی قوم وملت کی اس تعمیری حقیقت سے باخبر رہنا صرف اس لئے ضروری نہیں، کہ وہ ہے، اور وہ اس سے بنی ہے، بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی تجدید واصلاح کی جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس حقیقت کا واقف کار اسی کے ذریعہ سے اس کی تجدید و مرمت کرے، اس کی وہ تعمیری حقیقت وہ ساز ہوتا ہے، جس کے چھیڑنے سے اس قومیت وملّت کا ہر تار اپنی جگہ پر حرکت کرنے لگتا ہے، اہل توحید کے لئے توحید کی آواز، اہل صلیب کے لئے صلیب کی پکار، گاؤ پرست کے لئے گائے کی آواز سحر وطلسم کا حکم رکھتی ہے، جس سے ایک لمحہ میں قوم کی قوم میں جان پڑ جاتی ہے، اور سست وناکارہ قوم بھی کروٹیں بدلنے لگتی ہے، اور آواز کی طاقت کے مطابق سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔

فرض کرو دنیا میں آج چالیس کروڑ کی تعداد میں ایک ملّت آباد ہے۔

جس کا نام مسلمان ہے، اس ملت کی حقیقت کیا ہے؟ توحید الٰہی اور رسالت محمدی پر ایمان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اگر کوئی اس ملت کی حقیقت تعمیری کو مٹا ڈالے تو یہ چالیس کروڑ ملت واحدہ، چالیس کروڑ قومیتوں میں منقسم ہو کر دم کے دم میں فنا ہو جائے گی، اور یہ چالیس کروڑ افراد کا کارواں جو ایک صدائے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے جرس پر حرکت کر رہا تھا۔ اب اس کی حرکت کے لئے مختلف آوازوں کے چالیس کروڑ جرسوں کی ضرورت پیش آئے گی، جس سے دنیا کی قوموں کا تصادم بجائے کم ہونے کے حد قیاس سے زیادہ بڑھ جائے گا، اور ان کے باہمی جنگ وجدل کو کوئی ایک متحدہ آواز روک نہیں سکتی۔

الغرض ملت کی یہ تعمیری حقیقت، ہر ملت کی روح ہوتی ہے، اس کی بقا سے اس کی زندگی، اور اس کی موت سے اس کی فنا ہوتی ہے، یہی ملت کے جسم کا گرم خون ہے جس سے رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑتی، اور سعی وعمل کی قوت بیدار ہوتی ہے۔

کسی قوم کی اس اساسِ ملت، اور بنیاد وتعمیر سے ہٹ کر جب کبھی اس کی تجدید کا کام کیا جائیگا تو وہ ساری کوشش بیکار جائیگی۔ فرض کرو کہ ایک ہندو قوم ہے، اسکی قومیت کی بنیاد، وہ خاص تخیلات وجذبات ہیں، جو ہزارہا سال سے اس میں پیدا ہو کر، اس کی حقیقت کے اجزا بن گئے ہیں، ذات پات، چھوت چھات، گائے اور گنگا، وہ مسالے ہیں جن سے اس کی قومیت کی تعمیر ہوئی ہے، بودھ کے عہد سے آج تک مختلف وقتوں میں بیسیوں ریفارمر اس قوم میں پیدا ہوئے جنھوں نے اس قوم کی ماہیت کے ان اجزا کو بدل دینا چاہا ہے۔ مگر کیا یہ آج تک ممکن ہوا؟ اور جب کبھی اس آواز میں عارضی کامیابی بھی ہوئی، تو بودھ، جین، کبیرپنتھی، سکھ قومیں الگ الگ بن گئیں، مگر ہندو قومیت اپنی جگہ پر قائم رہی۔

مسلمانوں میں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک بیسیوں تحریکیں

مسلمانوں کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کے نام سے اٹھیں اور پھیلیں، مگر جو کامیابی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کو حاصل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی ذہنی و عملی قوی کے بیدار کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ تجدید اسلام کے اصل و اساسی نظامِ حقیقی کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی تھی، اور اس کے بعد بھی موجودہ زمانہ تک اسی تحریک کو فروغ ہو سکا جو اسی اساسِ ملت کے نام سے پیش کی جاتی رہی، اس کامیابی کا عارضی اور ہنگامی ہونا دراصل خود کارکنوں اور تحریک کے علمبرداروں کے عارضی یقین اور ہنگامی ایمان کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے بغیر عمل ممکن نہیں

اب اس تشریح کے بعد اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا، کہ دنیا میں کوئی ترقی یافتہ قوم، یا ترقی چاہنے والی قوم ممکن ہی نہیں جس کے پاس چند ایمانیات نہ ہوں، یا یوں کہو کہ چند اصولِ کار، اصولِ حیات، یا اصولِ نظام نہ ہوں جس سے اس کی قومیت کی تخلیق ہوتی ہے، اور جن پر اس کی ملت و تمدن و حیاتِ اجتماعی کی عمارت قائم ہوتی ہے، اور جو اس کے منتشر افراد کے درمیان رشتۂ اشتراک کا کام دیتے ہیں، اور جن کے تحت میں اس قوم کے نظامِ حیات کے تمام شعبے مکمل ہوتے ہیں یہاں تک کہ کافر و مشرک قومیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں، ان کے بھی تمام اعمال و افعال ان کے چند یقینی تخیلات اور عقائد ہی کے تحت میں آجاتے ہیں، اس حالت میں یہ کہنا کہ ایمانیات کے بغیر ترقی کے حسنِ عمل یا انسانیت کی نیکی کردار کا وجود ہوتا ہے، حقائق سے ناواقفی کا ثبوت ہے، ایمانیات کے بغیر حسنِ عمل اور نیکیِ کردار کیا، بلکہ نفسِ عمل اور نفسِ کردار ہی کا وجود ممکن نہیں اب اگر بحث ہو سکتی ہے، تو اس میں نہیں کہ ایمانیات کے بغیر حسنِ عمل اور نیکیِ کردار کا وجود ہو سکتا ہے، یا نہیں، بلکہ اس میں کہ

ان ایمانیات کے تحت میں حسنِ عمل اور نیکیِ کردار کا وجود زیادہ بہتر ہو سکتا ہے، یا اُن ایمانیات کے تحت میں؟ لیکن یہ نہیں کوئی کہہ سکتا کہ کسی "ایمان" کے بغیر کوئی عمل کسی نظامِ حیات کے بغیر کوئی بلند کارنامۂ حیات، اور کسی بنیاد کے بغیر کوئی مستحکم عمارت قائم ہو سکتی ہے آپ اس کا نام انسانیت رکھیں، قومیت رکھیں، وطنیت رکھیں، بالشوازم رکھیں، بت پرستی رکھیں، یا توحید یا خداشناسی رکھیں، جو چاہے رکھیں، اور جو چاہے قرار دیں، بہرحال یہ مقدمہ اپنی جگہ پر مسلم ہے، کہ "ایمان" کے بغیر عمل صالح کا وجود ممکن ہی نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا وہ اساسی خیال، جس پر ہماری ملت کی بنیاد ہو، اور جو ہمارے تمام اعمال کا سرچشمہ بنے کیا ہونا چاہیئے؟

نسل و وطن کے عقیدہ کی ناکامی

دنیا کی قوموں نے اساسِ ملت کی بنیاد جغرافی حدود، اور نسلی خصوصیت کو قرار دیا، رومیوں کی ہزار سالہ حکومت رومی وطنیت کے سہارے پر قائم رہی، ہندوؤں، پارسیوں اور یہودیوں کی قومیت نسلی امتیاز پر مبنی ہے، یورپ کی موجودہ قومیتیں نسل و وطن کی دوہری دیواروں پر کھڑی ہیں، لیکن خود غور کرو کہ جغرافی حدود اور نسلی و وطنی خصوصیات نے قوموں کو کتنا دل تنگ، محدود خیال اور متعصب بنا دیا ہے، دنیا کی اکثر خونریزیاں، لڑائیاں، اور قومی منافرتیں، انھیں جذبات نے پیدا کی ہیں، قدیم تاریخ میں ایران و روم کی صد سالہ جنگ، اور خود یورپ کی گذشتہ عالمگیر جنگ جس میں انسانوں نے انسانوں کو درندوں کی طرح چیرا اور پھاڑا، اسی نسلی و وطنی جذبات کی شعلہ افروزی تھی اور آج کا خونی تماشا بھی اسی جذبہ کا نتیجہ ہے۔

یہ نسلی و وطنی افتراق قوموں کے درمیان وہ خلیج ہے، جس کو انسانوں کے

ہاتھ کبھی پاٹ نہیں سکتے، نہ تو فطرۃً کسی نسل و قومیت کا کوئی پیدا شدہ انسان دوسری نسل و قومیت میں داخل ہو سکتا ہے، اور نہ ایک مقام کا پیدا شدہ دوسرے مقام کا پیدا شدہ بن سکتا ہے، نہ کالا گورا ہو سکتا ہے اور نہ گورا کالا، نہ فرنگی زنگی بن سکتا ہے، نہ زنگی فرنگی، نہ جرمن کو انگریز بنایا جا سکتا ہے نہ انگریز کو جرمن! نہ افغانی ہندوستانی ہو سکتا ہے، نہ ہندوستانی افغانی آج پولینڈ کے کھنڈروں سے لیکر رومانیا کے روغنی چشموں تک جو زمین خون سے لالہ زار ہے اسکا سینہ کیا اسی نسلی و وطنی خونخواریوں سے داغدار نہیں۔

غرض نسل و وطن کے دائرے اس مضبوطی سے فطرۃً محدود ہیں، کہ ان کے اندر تمام دنیا تو کیا، چند قوموں کے سمانے کی بھی وسعت نہیں ہے، ان دونوں کے جذبات و احساسات صرف ایک مختصر و محدود قوم کی جامعیت کا کام دے سکتے ہیں، کسی عالمگیر امن و صلح، اور انسانی اخوت و برادری کی توسیع اس سے رکھی ہی نہیں جا سکتی۔

پھر ان دونوں محدود تصوّرات کے ذریعہ سے اگر انسانوں میں کچھ شریفانہ جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، تو وہ انہیں تنگ جغرافی و نسلی دائروں تک محدود رہیں گے۔ اور کبھی تمام دنیا کے اس کے اندر سما جانے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا، علاوہ ازیں ان اساسی تصوّرات کے ذریعہ جن بلند انسانی اخلاق اور کیرکٹر کا پیدا کرنا مقصود ہے، ان میں سے صرف نسل و وطن کی حفاظت کی خاطر شجاعت، ایثار، اور قربانی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں، مگر عمومی نیکی، تواضع، خاکساری، رحم، شفقت، عفت، صدق، امانت وغیرہ سیکڑوں ایجابی اور سلبی اخلاق ہیں، جو ان کے ذریعہ نہ کبھی پیدا ہوئے ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔

آج کل یورپ کی تمام جنگ و جدل اور باہمی ہنگامہ آرائی اور تقابل کا وہ پتھر جس سے ان کی دولت، اور تہذیب و تمدّن کا شیشہ چور چور ہو رہا ہے۔ یہی تنگ و محدود وطنیت و قومیت کا عقیدہ ہے، یہ وہ دیوتا ہے جس پر یورپ کی تمام قومیں

بھینٹ چڑھ رہی ہیں، ہر قوم کے تمام دولت مندوں کی دولتیں، تمام عالموں کا علم، تمام سائنس دانوں کی سائنس، تمام صناعوں کی صنعتیں، تمام موجدوں کی ایجادیں، اپنی قوم کے سوا دنیا کی دوسری انسانی قوموں کی گرفتاری، محکومی، بربادی، اور ہلاکت میں صرف ہو رہی ہیں۔

آج نازازم اور فسزم کا دور ہے، جس نے ایک بدترین مذہب کی صورت اختیار کرلی ہے، جس میں ہر قسم کی حیوانی قوت کی نمائش، ہر قسم کی ہلاکت اور انسانی بربادی کا مہیب ترین منظر، اور قوت کے دیوتا کے سامنے ہر اخلاقی اور قانونی آئین کی قربانی کا تماشا سب کے سامنے ہے، یہ جو کچھ ہے یہ وہی قومیت اور وطنیت کی خونخوارانہ بت پرستی کا عبرتناک نظارہ ہے، جس سے نوع انسانی کی کسی بھلائی کی توقع نہیں ہوسکتی۔

اقتصادی عقیدہ کا فریب

سوشلزم اور بالشوازم اور دوسرے اقتصادی خیالات سے بھی بھلائی کی توقع نہیں کہ اس نے خود انسانوں کو سرمایہ دار و غیر سرمایہ دار دو مختلف حصّوں میں تقسیم کرکے وہ سب کچھ کیا ہے، اور کرنا چاہتی ہے جو کبھی کسی مذہب اور مذہبی محکمہ تفتیش نے انجام دیا ہے، قوموں کے ساتھ اُن کی ناانصافی کا تماشا آج بھی دنیا ترکستان سے لیکر فین لینڈ تک دیکھ رہی ہے، اگر زبردستی کوئی بُری چیز ہے، تو مذہب سے زبردستی روکنا بھی اتنی ہی بُری چیز ہے، جتنا زبردستی سے کسی مذہب کا پھیلانا، اگر مسلمانوں کا گرجاؤں کو توڑنا، اور عیسائیوں کا مسجدوں کو منہدم کرنا ناجائز ہے، تو ملحدوں کا ان دونوں کو مسمار کرنا بھی ناجائز ہے۔

پھر ان تخیلات میں جن کی بنیاد محض پیٹ اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہے، کسی اخلاقی نصب العین بننے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی لئے ان کا محدود اقتصادی

نظریہ پورے نظامِ ہستی اور نظامِ زندگی کا معمہ حل نہیں کر سکتا۔

ان سب کے ماوراء یہ ہے کہ ضرورت تو یہ ہے کہ نسلیت و وطنیت کے تنگ دائروں سے نکل کر جس عمومی تصوّر کو اساسِ ملّت بنایا جائے، اُن میں بقا اور دوام کی صلاحیت ہو، سوسائٹیاں اور جماعتیں جن کی بنیاد کسی مادّی خود غرضی اور منفعت اندوزی پر رکھی جائے، وہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتیں، چنانچہ جب سے دنیا بنی ہے، خدا جانے مادّی اغراض کی بنا پر کتنی جماعتیں اور مجلسیں قائم ہوئیں، اور مٹ گئیں، انجمنیں روز بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، اور سوسائٹیاں روز پیدا ہوتی ہیں، اور مرتی ہیں، ایسی ناپائدار اور سطحی چیزیں جامعیت ملّت کی بنیاد اور اساس نہیں بن سکتی ہیں، اور نہ وہ ہمارے نظامِ حیات کا اصول اور معیار قرار پا سکتی ہیں۔

صحیح ایمان کے ضروری خصوصیات

غرض عالمگیر عمومی اور دائمی اساسِ ملت اور صحیح بنیادِ عمل بننے کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز اساس و بنیاد قرار دی جائے، اس میں حسب ذیل خصوصیتیں ہوں:

۱۔ وہ کوئی مادّی غرض و غایت کی چیز نہ ہو، جو ہمیشہ بدل جاتی رہے۔

۲۔ وہ کوئی محدود وطنی، نسلی بت نہ ہو، جو اپنے نسل و وطن سے باہر جا کر زندہ نہ رہ سکے۔

۳۔ وہ قومی نسلی اور وطنی منافرتوں اور تفرقوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر عالمگیر اتحاد اور اخوت کی بنیاد ڈال سکے۔

۴۔ وہ تخیّل عقیدہ بن کر ہمارے نیک افعال کا محرّک، اور بُرے افعال کا مانع بنے، وہ انسانوں کو نیکی کے لئے ابھار سکے، اور برائی سے روک سکے۔

۵۔ وہ ایک ایسا دائمی صحیح اور سچّا عقیدہ ہو، جس کو مان کر اس برادری میں داخل ہونے میں کسی کو دقت نہ ہو۔

۶۔ وہ ایک طرف بندوں میں اپنے خالق کے ساتھ گرویدگی اور بندگی کا تعلق پیدا کرے اور دوسری طرف اپنی ہمجنس مخلوقات کے ساتھ محبت اور ادائے حقوق کا جذبہ پیدا کرے۔

اسلام میں عقائد کی حقیقت اور اہمیت

ان چند عقلی مبادی کے ثبوت کے بعد اب آیئے اسلام کے اصول عقائد و مبادی کا جائزہ لیں اسلام میں جس حقیقت کو عقائد کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت یہی چند ذہنی اصول و مبادی ہیں، جو جماعت کا کریڈ، اور تمام انسانی افکار و خیالات کی بنیاد اساس ہیں، انسان کے تمام افعال، اعمال، اور حرکات اسی محور کے گرد چکر کھاتے ہیں یہی وہ نقطہ ہے، جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے، اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں انھیں چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اُس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا۔

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (صحیح بخاری) : انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہو، تو تمام بدن درست ہو اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل میں قَلْبٌ اٰثِمٌ[1] (گنہگار دل)

---

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ۔

یہ وہ ہے جو ہمیشہ گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے، اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِيْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں، جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (صحیح بخاری آغاز کتاب) تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا۔

انما لامرئ ما نوی فمن کانت ہجرتہ الی دنیا یصیبہا او الی امرأۃ ینکحہا فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے، جس کی وہ نیت کرے، تو جسکی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہو تو اسکی ہجرت اسی کیلئے ہے جسکے لئے اس نے ہجرت کی، (یعنی اس سے اسکو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے، کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے، اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین، اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے، نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کرلیتا۔

جن کو ہم عقیدہ کہتے ہیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات، اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، اس لئے اس پا بہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات، اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے "ایمان" کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے، اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے۔ کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا، جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، لیکن با ایں ہمہ مشرک تھا، اُس کی نسبت آنحضرت صلعم سے حضرت عائشہ رضہ نے ایک دفعہ دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا اُن کا ثواب اس کو ملے گا؟" فرمایا، "نہیں اے عائشہ! کیونکہ کسی دن اُس نے یہ نہیں کہا کہ بارالہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخشدے [۱]"

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی، حاضر ہو کر کہا "اے محمد صلعم! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں، کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے۔" فرمایا "کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلعم پر ایمان رکھتے ہو؟" اس نے جواب دیا "نہیں" فرمایا "واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں" دوسری دفعہ وہ پھر آیا، اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ غزوات، نسخہ قلمی دار المصنفین، و ابن حنبل جلد ۶ صہ ۱۲۹، مصر۔

اس کی شجاعت وبہادری کیوجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی، اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے، لیکن آنحضرت صلعم نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ "کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے"؟ اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت صلعم نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا" غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی اس کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی، اور آپ نے فرمایا کہ "تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے"؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا، تو اسلامی فوج میں ایک مجاہد کی حیثیت سے اسکو داخل ہونے کی اجازت ملی[1] اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ جماعت میں داخل ہونے کے لئے اس کے کریڈ اور عقیدہ کو تسلیم کرنا اس جماعت کی مضبوطی کی سب سے پہلی شناخت ہے۔

غرض اسلام کے نقطۂ نگاہ سے بھی ایمان ہی ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے، جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے، جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں، مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار، اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہوکر رہجائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے، اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد، ریا، نمائش جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا، کچھ اور نہ رہجائے۔

---

[1] ۔ صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر۔

ایمان کے اجزاء

اسلام نے چونکہ علم وعمل، تصوّر اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا ہے اور عقائد کی راہ سے ہی اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا ہے، اس لئے اُس نے عقائد کے اتنے ہی حصّہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا ہے جو عمل کی بنیاد، اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، اور دل کی اصلاح و تزکیہ میں کام آ سکے اور اسی لئے اُس نے عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول ہیں جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، اور انہیں پر یقین کرنے کا نام "ایمان" ہے اور صریح الفاظ میں اس ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کئے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان، اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

ان اجزائے ایمانی کی حکمت

اللہ تعالٰے پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے، اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے، اور اُس کی رضاجوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو، اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں، اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اُس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض، اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں، اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں، ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک، اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی

سچّائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط اشتعالات ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم انھیں کے واسطے سے انسانوں کو پہونچا ہے، اگر ان کی صداقت سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربّانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے، اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے، کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادّیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں، اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ "ریکارڈ" کرتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ہیں ان کو دور دراز ملکوں اور آیندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں میں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکّب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچّائی پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے، اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی بازپرس اور جوابدہی کا یقین اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال

نہ ہو، تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اور اسی لئے محمدؐ رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے، بلکہ مکیؐ وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اُسکے تمام رسولوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے فرشتوں پر، اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورہ بقر میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات، اور ملائکہ) پر ایمان
...... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا	رکھتے ہیں ...... اور جو کچھ تم پر (اے محمدؐ) اترا اور تم سے پہلے
اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ	(پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیا
قَبْلِكَ (بقرہ-۱)	اور ان کی کتابوں پر)۔
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ-۱)	اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ	فرشتوں پر، اور کتاب پر، اور سب نبیوں پر ایمان
الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (بقرہ-۲۲)	لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ	پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا، اس پر وہ خود اور تمام مومن
رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ	ایمان لائے، یہ سب لوگ خدا پر، اسکے فرشتوں[۲] پر،
مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ-۴۰)	اسکی کتابوں[۳] پر، اور اسکے پیغمبروں[۴] پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں انھیں عقائد کی تعلیم ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ؕ	اے وہ لوگو! جو ایمان لاچکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اور اسکے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری، اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص خدا کا، اسکے فرشتوں کا، اسکی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا، اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا۔ وہ سخت گمراہ ہوا۔

ایمان و عمل کا تلازم

سچے ایمان اور حسنِ عمل درحقیقت لازم و ملزوم ہیں، اگر کوئی یہ کہے کہ ایک مومن بدکار ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ سوال حقیقت میں خود تضاد کو مستلزم ہے، اس لئے احادیث میں آتا ہے کہ کوئی مومن ہو کر بدکاری اور چوری نہیں کر سکتا ہے، اگر کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان مسلوب ہو جاتا ہے، اور یہ بالکل واضح ہے کہ جب کوئی مومن برائی کرنا چاہتا ہے، تو اُس کے ایمان یعنی اصول اور جذباتِ فاسدہ کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے، تھوڑی دیر یہ لڑائی قائم رہتی ہے، اگر ایمان اور اصول نے فتح پائی تو وہ اپنے کو بچا لیتا ہے، اور اگر جذبات غالب آتے ہیں تو ایمان اور اصول کا تخیل اسوقت دب کر اُس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس بنا پر سچا مومن اور بدکردار ہو، یہ ممکن ہی نہیں، اگر ہے تو حقیقت میں ایمان ہی کامل نہیں، یہاں بحث رسمی ایمان و مومن سے نہیں بلکہ اُس ایمان سے ہے، جس کے معنی غیر متزلزل یقین اور ناقابلِ شک اعتقاد کے ہیں، جہاں کہیں رسمی و ظاہری ایمان کے ساتھ برائی اور بدکرداری کا وجود ہے، وہ درحقیقت ایمان کا نقص اور یقین کی کمی کے باعث

ہے عمل صالح کی کمی بھی ایمان ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے بغیر کوئی عمل درست نہیں

لیکن بہرحال عقلی فرض اور رسمی ایمان کے لحاظ سے یہ سوال ہو سکتا ہے، اور یہ مانا جا سکتا ہے کہ ایک بدکردار مومن اور نیک اخلاق کا فرد مشرک ہیں اگر پہلا نجات کا مستحق ہے اور دوسرا نہیں ہے تو ایسا کیوں؟ اس کا جواب شرعی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے بالکل ظاہر ہے، اسلام نے نجات کا مدار ایمان اور عمل دونوں پر رکھا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (عصر)	بیشک کل انسان گھاٹے میں ہیں وہ جو ایمان رکھتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں۔

اس لئے کامل نجات کا مستحق وہی ہے، جو مومن بھی ہے اور نیک کردار بھی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو خدا کفر و شرک کے گناہ کے سوا اپنے بندہ کا ہر گناہ چاہے تو معاف کر سکتا ہے، البتہ شرک و کفر کو معاف نہ فرمائے گا، اور اس کی سزا ضرور وہ دیگا، چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا (نساء-۷)	بیشک خدا اسکو معاف نہ کریگا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے، اور اُسکے سوا دوسرے گناہ جس کو چاہے گا معاف کر دیگا۔

ایک اور آیت میں مشرکوں کے متعلق یہ قطعی طور سے فرمایا۔

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ (مائدہ-۱۰)	بیشک یہ بات ہے کہ جو اللہ کے ساتھ شرک کریگا تو اللہ نے اس پر اپنی جنت حرام کی ہے۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس

راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اوڑا اوڑا کر فنا کر دیتے ہیں، اور انکا کوئی وجود پھر باقی نہیں رہتا، اسی طرح وہ شخص جو ایمان سے محروم ہیں اُس کے کام بھی بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (ابراهیم ۲)

جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، انکے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے، کہ اُس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور ۵)

جنھوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اسکو نظر نہ آئے۔

ان کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے، جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا، اور جس میں ہوش وحواس اور اعضا کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ (نور)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اسکے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہو اور اسکے اوپر بادل گھرا ہو، یہ اندھیرا ہے کہ اسمیں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جسکو خدا نے نور نہ دیا، اُس کے لئے کوئی نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دیجاتی، وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں، لیکن کرنیوالے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت صلعم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (البقرہ ۳۶)	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان اور اذیتِ دیگر اُس طرح برباد کرو، جسطرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانیکے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہو اور خدا پر جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے اور قیامت پر جہیں نیکیوں کی جزا ملیگی یقین نہیں کرتا، اسکی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جسپر کچھ مٹی پڑی ہو، ذرا اس پر پانی برسا تو مٹی دھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائیگا وہ اُگے گا نہیں۔

مومن و کافر کا فرق

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ ایک بدکردار رسمی مومن کے لئے نجات کی امید ممکن ہے، لیکن ایک حقیقی کافر و مشرک کے لئے نہیں، اور اس کی عقلی وجہ ظاہر ہے، ایک بدکردار رسمی مومن اور حقیقی کافر و مشرک کے درمیان وہی فرق ہے جو ایک چور اور ڈاکو کے درمیان ہے، ہر قانون داں جانتا ہے کہ ان دونوں میں قانون کی نظر میں کون مجرم زیادہ ہے، چور گو برائی کرتا ہے تاہم حکومت کا خوف اس کے دل میں ہے، مگر ڈاکو حکومت سے برسر پیکار ہو کر قتل و غارت کا مرتکب ہوتا ہے، اس لئے ڈاکو، چور سے زیادہ سزا کا مستحق ہے، بدکردار رسمی مومن، گو گنہگار ہے، مگر

کبھی کبھی خوفِ الٰہی سے تھرّا جاتا ہے، کبھی کبھی خدا کی بارگاہ میں گڑگڑاتا بھی ہے، اور کبھی اپنے گناہوں پر خدا کے حضور میں شرمندہ اور نادم بھی ہوتا ہے، مگر کافر و مشرک، اگر کچھ اچھے کام بھی کریں، تاہم اپنی دوسری برائیوں کے استغفار کے لئے خدا کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے، وہ خدا نام کسی ہستی کے قائل ہی نہیں، جسکے خوف سے وہ تھرّائیں، جس کی بارگاہ میں وہ گڑگڑائے، اور جس کی محبت میں سرشار ہوکر وہ اس کے احکام کی تعمیل کریں، اس لئے اس جرم کے لئے جس نے کسی مجبوری سے معذور ہوکر چھپکر کسی قانون سلطنت کی نافرمانی کی رحم و بخشش کا موقع ہے، لیکن اس باغی کے لئے جو سرے سے سلطانِ وقت کو اور اس کے قانون ہی کو تسلیم نہیں کرتا رحم و بخشش کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن یہ محض ایک تمثیل تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کو اس کی حاجت نہیں، کہ اس کے بندے اس کی حکومت کو تسلیم کریں اِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (بیشک خدا دنیا سے بے نیاز ہے)۔

بلکہ اصل یہ ہے کہ ایک کافر و مشرک اس اصولِ کار کو تسلیم نہیں کرتا، جس پر مذہبی نیکیوں کی بنیاد ہے، اور ایک رسمی مومن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے مطابق عمل نہیں کرتا، تو گو بُرے دونوں ہیں، لیکن جو اصولِ کار کی صحت کو تسلیم کرتا ہے، اس کی نسبت توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آج نہیں تو کل عمل بھی کرے گا، لیکن جو ہنوز اصول کا مخالف ہے اُس کے لوٹنے کے لئے ابھی بڑی دشوار منزل باقی ہے۔

ایمان یعنی اساسِ ملّت اور بنیادِ عمل کی اہمیت

اس خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر بھی اگر مومن و کافر کے باہمی فرق و امتیاز پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ گو بہت سے بظاہر نیک لوگوں کو جو کافر ہیں اپنے سے

الگ کرنا پڑتا ہے، اور بہت سے بظاہر برے لوگوں کو جو مومن ہیں، اپنے اندر داخل کرنا پڑتا ہے، تاہم اس موقع پر اس نکتہ کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اس "اپنے" اور "غیر" کی وجہ تقسیم کیا ہے ؟ جب اس وجہ تقسیم کو ہم سامنے رکھیں گے تو ہم کو ناگزیر طور پر ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ وجہ تقسیم خیرات کرنے والا اور نہ خیرات کرنے والا، یا جھوٹ بولنے والا اور نہ جھوٹ بولنے والا نہیں ہے، بلکہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والا، اور ایک دستور العمل (قرآن) کو صحیح ماننے والا ہے، اس بنا پر اس وجہ تقسیم کی رو سے ایسا ہونا لازم ہے۔

یہ طریقۂ امتیاز کچھ اسلام یا مذہب ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک ہر جماعت اور ہر اصول سیاست، بلکہ تمام انسانی تحریکات اور جماعتوں کا اصول تقسیم یہی ہے، ہر تحریک کا ایک نصب العین، اور ہر جماعت کا ایک عقیدہ (کریڈ) ہوتا ہے، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اس کریڈ کے مطابق پورے جوش و خروش کے ساتھ عمل کرتے ہیں، یہ اس مذہب کے مومنین صالحین ہیں، دوسرے وہ ہیں جو اس کریڈ کو گو صحیح تسلیم کرتے ہیں، مگر تغافل، سستی، یا کسی اور عارضی سبب سے اس کریڈ کے مطابق عمل نہیں رکھتے، یہ اس مذہب کے غیر صالح مومنین ہیں، لیکن ایک تیسری جماعت ہے جو سرے سے اس کریڈ ہی کو تسلیم نہیں کرتی، اور نہ اسکو بنیاد عمل قرار دیتی ہے، گو اس تیسری جماعت کے بعض افراد بڑے فیاض و مخیر ہوں یا بڑے عالم و فاضل ہوں تاہم اس جماعت کے دائرہ کے اندر جس کا وہ کریڈ ہے، ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، کیا یہی وجہ نہیں کہ کانگریس کے کریڈ پر یقین رکھنے والا اور اس کے مطابق عمل کرنے والا اور وہ بھی جو نفس کریڈ کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے مطابق عمل پیرا نہیں، کانگریس کے پنڈال میں جگہ پا سکتا ہے، مگر وہ جو اس کریڈ ہی کو صحیح باور نہیں کرتا، اس کے احاطہ میں کوئی جگہ پانے کا مستحق نہیں ہے، اسی پر ہر جماعت

سے اصول کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب تک کوئی جماعت اپنے اصولِ کار، اساسِ جماعت اور عقیدہ کو اتنی اہمیت نہ دیگی، اس کی اہمیت جو سب اہمیتوں سے بڑھکر ہونی چاہیئے قائم نہیں رہ سکتی، اور ملت کی وہ دیوار جس کو اس قدر سخت اور مستحکم ہونا چاہیئے کہ باہر کے سیلاب کا ایک قطرہ بھی اس کے اندر نہ جا سکے، اگر اس میں اصول وعقیدہ پر ایمان کا مطالبہ کئے بغیر ہر کس وناکس کو داخل کی اجازت دیدی جائے تو اس مستحکم دیوار میں یقیناً رخنے پڑ جائیں گے، اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور وہ جماعت ایسے پراگندہ اصول افراد کا مجموعہ ہو گی جس کو کسی اتحاد واشتراک وجامعیت کا رشتہ باہم متحد ومشترک ومجموع نہیں کرتا۔

مستحکم جماعتیں وہ ہیں جو اپنے کریڈ پر شدت کے ساتھ جمی رہتی ہیں، اور جو اس کریڈ کو تسلیم نہیں کرتا رکنِ جماعت نہ ہونے کی حیثیت سے وہ ان کی جماعتی برادری میں کوئی اعزاز نہیں رکھتا، کیا ایک مسلمان جب کانگریس کا ممبر ہو، یا مسلم کانفرنس یا لیگ کا رکن ہو تو اس کے لئے تو اصولِ کار کی یہ سختی جائز بلکہ مستحسن ہو، مگر وہی اسلامی جماعت کے ممبر کی حیثیت سے اپنے اخلاقی اصولِ کار، اساسِ ملت اور مذہبی بنائے وحدت میں یہ شدت روا رکھے تو کس عقل سے وہ ملامت کے قابل ٹھہرایا جائے، حالانکہ ہر دلی عقیدہ کا لازمی نتیجہ اسی قسم کی شدت اور استحکام ہونا چاہیئے، پھر اگر ایک جگہ وہ ہو اور دوسری جگہ نہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ایک کو دل کے ساتھ جو تعلق ہے، وہ دوسرے کو نہیں۔

نظامِ اسلام

اب اگر اسلام، اور اسلام کے قانون اور مذہب کو سمجھنا ہے، تو اس کی

اصل بنیاد پر نظر رکھنا چاہیئے، جس پر اس کی یہ پوری عمارت تعمیر ہوئی ہے، وہ بنیاد اقتصادیات کا کوئی نکتہ، دولت کا کوئی خزانہ، نسل و رنگ کا کوئی امتیاز، اور ملک و وطن کی کوئی تحدید نہیں ہے، بلکہ صرف ایک ہے، اور وہ دنیا کی سب سے بڑی لازوال، اور وسیع و عالمگیر صداقت، یعنی خدائے واحد پر ایمان ہے، یہ ہے اسلام کی ملّت اور برادری کا اصل رشتہ، اسی سے اس کے مذہب اور اس کے قانون کی تمام تقسیمیں اور امتیازات کی حدیں قائم ہوئی ہیں، اس کی حیثیت اسلام کی مملکت میں وہ ہے جو کل روم میں رومیت کی، اور آج روس میں اصول بالشویت کی ہے۔

اس برادری کے دینی اور دنیاوی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس جماعت کے فارموں پر دستخط کرے، اور اس کے کریڈ کو دل و جان سے قبول کرے، آج تمام مہذب دنیا کسی عالمگیر برادری کی بنیاد کو تلاش کرنے میں حیران و سرگرداں ہیں، مگر نہیں ملتی، حالانکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی طرح آج بھی اسلام یہ آواز بلند کر رہا ہے کہ:۔

> "اے اہل کتاب آؤ! ہم اس ایک بات پر متفق ہوجائیں، جو ہمارے اور تمہارے نزدیک یکساں ہے، کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں، اور خدا کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں۔"

یہی توحید اسلام کا وہ نظامنامہ ہے جس پر اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کی بنیاد ہے۔

توحید دنیا کی غیر متبدل حقیقت

یہ توحید یعنی عرصۂ ہستی کا صرف ایک فرمانروائے مطلق ماننا جس کے سامنے ہر جسمانی و روحانی طاقت ادب سے جھکی ہوئی ہے، اور اس کی بندۂ فرمان ہے، اور ساری دنیا اسی ایک کی مخلوق و محکوم ہے، اور دنیا کی ساری قومیں اُس کے آگے بحیثیت مخلوق کے برابر حیثیت رکھتی ہیں، دنیا کی وہ عظیم الشان حقیقت ہے جو سرتاپا صداقت اور حق ہے اور ایسی عالمگیر ہے، جو عرصۂ وجود کے ایک ایک ذرّہ کو محیط ہے، اور ایسی لازوال جس کو کبھی فنا نہیں، اور ایسی کھلی اور واضح کہ جس کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں، اور ایسی خیر مجسم جو ہمارے اندر ہر قسم کی نیکیوں کی تحریک کرتی ہے، اور جو ایسی تسکین اور تسلّی ہو جو ہر مصیبت اور مشکل کے وقت ہمارے لئے صبر واستقلال کی چٹان بنجاتی ہے، اور ایسا مضبوط اور مستحکم سررشتہ جو کسی وقت ٹوٹ نہیں سکتا اور اس قدر وسیع کہ جس کے احاطۂ عام کے اندر مخلوقات کی ایک ایک فرد داخل ہو کر اخلاقی حقوق و واجبات کی برادری قائم کر سکتی ہے، اور خالق و مخلوق دونوں کی وابستگی اور محبت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

غرض یہ ایسی عالمگیر حقیقت ہے، جو سرتاپا صداقت اور حق ہے جو کبھی نہ بدل سکتی نہ بدلے گی، زبانوں میں جو انقلاب ہو، خیالات میں جو تغیر ہو، تمدنوں میں جو اُتار چڑھاؤ ہو قوموں میں جو تفرقے پیدا ہوں، مجازی حقیقتوں، مادّی فائدوں، اور سیاسی غایتوں میں جو اختلاف بھی پیدا ہو۔ مگر وہ ایک حقیقت ہے جو اپنی جگہ پر مسلّم رہیگی اور جس میں کوئی تغیر اور انقلاب پیدا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی بنیاد ایک ایسی لازوال ہستی کے یقین پر ہے، جو مادّیات کی دنیا کی طرح دمبدم مٹتی اور بنتی، اور لحظہ بہ لحظہ متغیر اور منقلب نہیں۔

وہ ایک ایسی عالمگیر اور محیط ہستی کا تخیّل ہے، جس کے احاطۂ عام کے اندر تمام قومیں تمام مملکتیں بلکہ تمام مخلوقات یکساں استحقاق کے ساتھ داخل ہیں، اس کی ملکیت میں سیاہ وسپید، زنگی ورومی، ہندی و فرنگی، عربی وعجمی، امیر وغریب، عورت ومرد، شاہ پسند وجمہوریت پسند، حاکم ومحکوم، آقا اور غلام، عالم اور جاہل سب برابری کے ساتھ یکساں شامل ہیں، اور اس سے ایسی برادری کا رشتہ قائم ہوتا ہے جو قوموں میں میل، مملکتوں میں اتحاد، اور مخلوقات میں فرائض و واجبات کا احساس پیدا کرتا ہے۔

وہ خود مجسم خیر، اور سرتاپا نیکی ہے، اُس کی عقیدت اور محبت ہمارے اندر نیکیوں کی تحریک اور برائیوں کی نفرت پیدا کرتی ہے، تاریکی میں بھی اس کی دیکھنے والی آنکھوں، اور خلوتوں میں بھی اُس کی جھانکنے والی نگاہوں کا سچّا عقیدہ نازک سے نازک موقع پر بھی ہم کو برائیوں سے بچاتا، اور نیکیوں کے لئے ابھارتا ہے۔

جب ہمارا ہر سہارا ٹوٹ جاتا ہے، ہر اعتماد شکست ہوجاتا ہے، اور ہر امید منقطع ہوجاتی ہے، اور جب افراد واقوام کے صبر واستقلال کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، اور ان کے وجود کی کشتی منجدھار میں پھنس جاتی ہے، اس وقت اُسی ایک کی مدد کا سہارا کام آتا ہے، اور اسی ایک کی نصرت کا وثوق فتح وظفر سے ہم کنار کرتا ہے، اور مایوسیوں اور ناامیدیوں کے ہر بادل کو چھانٹ کر رحمتِ الٰہی کے نور سے آنکھوں کو پُرنور اور دلوں کو مسرور کردیتا ہے۔

اب کوئی بتائے کہ کسی ایسی قوم کے لئے جو اپنے کو دائمی اور ہمیشہ کے لئے روئے زمین پر آئی ہوئی اور آخرالامم، اور غیر منسوخ ملّت ہونے کی مدّعی ہو، اس کے اساس ملّت بننے کے لئے ہر روز بدل جانے والے، اور ہر صدی میں منقلب ہوجانے والے تخیّلات اور نظرئے کبھی اساسِ ملّت قرار پاسکتے ہیں، اور ایسی قوم کے لئے جو کسی نسل، کسی رنگت، اور کسی قطعۂ زمین میں اپنے کو محدود نہ کرے، اس عالمگیر خدائی برادری سے

بڑھ کر کوئی برادری مناسب ہو سکتی ہے؟

عقیدہ توحید کی اخلاقی حیثیت

پھر ایسا عقیدہ جو تنہا ہماری ملّت کا اساس ہی نہ ہو، بلکہ ہمارے عمل کی بھی بنیاد ہو، اس خلّاقِ عالم، اور علّام الغیوب کے ایمان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے، یہ لازوال اور زندہ جاوید ہستی ہماری ملّت کو لازوال اور زندہ جاوید بناتی ہے، یہ عالمگیر اور محیط ہستی ہمارے اندر عالمگیر اخوت اور عمومی برادری کا رشتہ قائم کرتی ہے، وہ خیرِ مجسّم اور سراپا نیک ہستی، ہم کو خیر کی دعوت اور نیکی کی صدا دیتی ہے، اُس کے کمالی اوصاف ہم کو اپنے اخلاقی کمال کا نصب العین عطا کرتے ہیں، اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کاملہ کا عقیدہ ہم کو ہر حیثیت سے حسین اور کامل بننے کا درس دیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ خدا اور اُس کی ذات و صفات پر اعتقاد محض نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اُس کی حیثیت تمام تر عملی ہے، اُس کی صفاتِ عالیہ ہمارے اوصافِ حسنہ کے لئے نمونہ ہیں اور اس کے محامد کریمہ ہمارے اعمال و اخلاق کی تصحیح کے لئے تحریر اوراق کا مسطر ہیں۔

خیر و شر کی تمیز

جس طرح دنیا کی دوسری چیزیں فی نفسہ نہ خیر ہیں نہ شر، ہم ان کو خیر یا شر صرف اُن کے موقع استعمال کے لحاظ سے کہتے ہیں، آگ فی نفسہ نہ خیر ہے نہ شر لیکن جب کوئی ظالم اُس آگ سے کسی غریب کا جھونپڑا جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے تو وہ شر ہو جاتی ہے، لیکن جب اسی آگ سے کوئی رحمدل انسان چولھا گرم کرکے کسی

بھوکے کے لئے کھانا پکاتا ہے تو وہ خیر ہو جاتی ہے، اسی طرح نیک و بداعمال بظاہر یکساں ہیں، اور ان میں نیک و بد کی تمیز نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ اس غرض وغایت کا لحاظ نہ کیا جائے، جس کے لئے وہ کام کیا جاتا ہے، ایک ڈاکو کا ایک مسافر کو قتل کر دینا، اور ایک حکومت کا کسی ڈاکو کو پھانسی دینا، یکساں اتلافِ جان کا فعل ہے لیکن پھر دنیا اگر ایک کو خیر اور ایک کو شر کہتی ہے، تو وہ اُس غرض وغایت کی بنا پر ہے جس کے لئے یہ دونوں قتل کئے گئے ہیں، ڈاکو جس قتل کا مرتکب ہوا ہے، اس سے اس کا مقصود مسافر کے مال پر ظالمانہ قبضہ تھا، اور اس راہ میں اس کے مالک کے ناحق قتل کا آخری نتیجہ راستہ کی بدامنی اور ملک کی ویرانی ہے اور سزا دینے والی حکومت کی غرض لوگوں کی جان و مال کی حفاظت، راستہ کا امن، اور ملک کو آباد کرنا ہے اس لئے پہلا فعل شر، اور دوسرا خیر ہے۔

خیر و شر کی فلسفیانہ تحقیق اُن کی باہمی تمیز نہایت مشکل ہے، جس کو نہ ہر عامی و جاہل سمجھ سکتا ہے اور نہ اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ خیر و شر کے اکثر امور پر تمام دنیا متفق ہے اس لئے مذہب نے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کے لئے ایک آسان اصول یہ وضع کر دیا کہ وہ تمام باتیں جن کو خدائے تعالیٰ پسند کرتا ہے، خیر ہے، اور جن کو ناپسند فرماتا ہے وہ شر ہے اس کے اس اصول سے نہ خیر و شر کی حقیقت بدلتی ہے، نہ اُن کے نفع و ضرر کا پہلو بدلتا ہے، نہ دنیا کے فائدے اور نقصان میں کمی بیشی ہوتی ہے، ہاں یہ ہوتا ہے کہ اس اصول کی تاثیر دلوں میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے، کہ جنگلی و صحرائی سے لیکر مہذب و تعلیمیافتہ تک اس اصول کے تحت خیر پر عمل کرنے اور شر سے بچنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، چنانچہ آج دنیا میں جس قدر بھی خیر کا وجود ہے، اور شر سے احتراز ہے وہ اسی پیغمبرانہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کا نہیں ارسطو اور اسپنسر کے اصول اخلاق کو پڑھ کر اور سمجھ کر کتنے نیک

اور خوش اخلاق پیدا ہوئے اور مسیح و محمد علیہما السلام کی تعلیم و تاثیر نے کتنوں کو خوش اخلاق اور نیک کردار بنایا، اور آج دنیا میں لندن و نیویارک کے بازاروں سے لیکر افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں اور ہندوستان کے دیہاتوں تک میں نیکی کی اشاعت اور برائی سے پرہیز کی تعلیم انبیاؑ کے پیرووں کے ذریعہ ہو رہی ہے یا فلسفیوں کے؟ بالشویکوں کے ذریعہ انجام پا رہی ہے یا نازیوں کے، سوشیلسٹوں کے ذریعہ یا فسسٹوں کے؟ دل کا چین اخلاق کی طاقت اور عالمگیر انسانی برادری کی دولت اگر ممکن ہے تو وہ صرف اس توحید کے ذریعہ جس کی دعوت اسلام دیتا ہے اور اُس ایمان کی بدولت جس کو اسلام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، جس کی وسعت میں ساری دنیا آرام کر سکتی ہے، اور جس کے سایہ میں انسانوں کے بنائے ہوئے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور جس کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ آسمان و زمین کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو ہٹ جائیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتی۔

۱۰۹۱۰